اُردو فکشن کی مابعد نو آبادیاتی قرأت: چند ابتدائی باتیں

ڈاکٹر محمد نعیم
(ادارہ زبان و ادبیات اُردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

Dr Muammad Naeem

Associate Prof Urdu,

Unjab University Lahore

Abstract:

Urdu fiction went through a substantial change during the colonial period. The colonial discourse narrated and disseminated through different technologies of educational subjugation and epistemological usurpation in official and historical works brought forth some serious changes in the world view of Urdu fiction writers. They discovered and presented the subjectivity of the colonialized. This essay presents some preliminary insights to understand and analyze the colonial Urdu fiction.

Key Words. Epistemology,Colonial Period, Japan, Australia, Malaysia, Amertiya seen, Ghalib, Kaaba, Bramin..

حقیقی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور انھیں پیش کرنے والے تقریری یا تحریری بیان میں فرق ہوتا ہے۔ آئینے جیسا شفاف میڈیم بھی کسی مظہر کی عکاسی کرتے ہوئے اسے عرضی طور پر الٹا دیتا ہے یعنی دایاں، بایاں نظر آتا ہے اور بائیں پہلو کا عکس داہنا محسوس ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ زبان جیسا سامع، پس منظر اور تناظر کا محتاج ذریعہ کسی واقعے کے بیان میں کتنا کچھ بدل دیتا ہو گا۔ ماضی ہم تک اسی پیہم بدلتی صورت میں پہنچتا ہے اور ہماری زندگیوں کو وہ تناظر فراہم کرتا ہے جس میں ہم خود کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس تفہیم کے لیے جان لینے اور دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

طاقت اس بیانیہ صورت کو شعوری طور پر بدلنے کی کوشش کرتی ہے۔ استعماریت کی صورتِ بیان کو بدلنے کی شعوری کاوش کی تفہیم اور اس کے خلاف مزاحمت تک کا سفر مابعد نو آبادیات کہلاتا ہے۔ جس ماضی کو ہم نے 'روایت'، 'رواج'، اور 'جدت' کے طور پر اپنایا ہے، اس کے بیانیے کی تشکیل استعماری دور میں ہوئی ہے۔ آج جن شناختوں پر ہمیں فخر ہے اور مذہبی، سیاسی، سماجی اور ادارہ جاتی تنظیم کی جن صورتوں کو ہم مذہب اور ثقافت بچانے کے لیے بطور آلہ کار استعمال کرتے ہیں ان کی تعمیر اسی دور میں ہوئی ہے جس سے ہمیں بظاہر نفرت ہے۔ ہمارا علم اسی علمیات (Epistemology) کا زائیدہ ہے جسے استعماریت نے تیار کیا تھا۔ طرزِ

احساس میں بنیادی تبدیلی بھی اسی دور میں ہوئی، جس نے ادب کے موضوع اور اسلوب ہر دو پر اپنے ان مِٹ نقوش ترتیب دیے۔ آیئے ان نقوش کو نمایاں کرتے ہیں۔

تاریخ ماضی کا محض بیان نہیں، ماضی کو ایک خاص طرزِ بیان میں دیکھنے اور پیش کرنے کا نام ہے۔ ہندوستان میں تاریخ نویسی خاندانوں، بادشاہوں، سیاسی و معاشی انتظام اور جنگ وجدل کے بیانات سے سروکار رکھتی تھی۔ انگریز نے جب یہاں کی تاریخ لکھی تو اسے مذاہب کی بنیاد پر تقسیم کیا: ہندو دور، مسلم دور اور برطانوی دور۔ عجیب بات ہے کہ آخری دور کو عیسائی نہ کہا۔ خود جغرافیائی قوم بن گئے ہمیں سمجھا گئے، قوم مذہب سے ہے۔ پھر مردم شماری کی اور آبادی کو گننے سے زیادہ مذہب اور ذات کے خانوں میں تقسیم کیا۔ ان تاریخوں کا بیانیہ مسلم اشراف نے اپنالیا کہ مسلمان ہندوستان کے باسی نہیں باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ یعنی ہندوستانیوں کی وہ بڑی تعداد جس نے مذہب قبول کیا وہ اس دائرے سے خارج تصور کی گئی۔ ادھر بنگال میں اٹھارویں صدی کی آخری دہائیوں کے دوران کمپنی کی عدالتوں میں پہلی بار مسلمانوں کے لیے شریعت کا ایک کوڈڈ متن تیار کیا گیا اور ہندوؤں کے لیے Gentoo Law بھی پہلی بار تبھی سامنے آیا۔ مردم شماری اور سروے کے ذریعے ہندوستانی آبادی کی تفہیم کا سفر اُنھیں یورپی علمی وضعوں میں تبدیل کر گیا۔ زبان، ثقافت، سماج اور فردسب کی یورپی علمیات میں تقلیب ہوئی۔ ہندوستانی معلومات، استعماری علم میں ڈھل گئیں۔ ایک مثال دیکھ لیجیے۔ انگریزی میں اسم نکرہ کے ساتھ عام طور پر an,a اور the لگا کر اسے معرفہ بنایا جاتا ہے جس طرح عربی میں 'ال' استعمال ہوتا ہے۔ گل کرسٹ کو اردو سے شکایت ہے کہ اس میں آرٹیکل نہیں ہے۔[1] تو بھائی اس سے کیا کسر شان میں آئی۔ گل کرسٹ اردو کو انگریزی کے آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ حال آں کہ جاننا چاہیے کہ زبانوں کا کینڈا مختلف ہوتا ہے اس سے کہاں لازم آیا کہ ایک افضل ہے دوسری مفضول۔ یاد رکھیے استعماری بیانیے میں فرق کا ہونا امتیاز کا جواز بنتا ہے۔

یہ بیان نصاب کی مدد سے عام ذہن تک پہنچا تو جدید شعور بن گیا۔ آنکھ دیکھتی ہے، تاہم اسے زاویہ نظر شعور عطا کرتا ہے۔ مصنف جب کہانی لکھتا ہے تو کردار کی شناخت سے لے کر پیش کش تک ہر جگہ یہ شعور بنت کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔ استعماری شعور سے پہلے ہم دھنک رنگی سماج تھے، جہاں رنگ مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے میں مدغم تھے۔ اب ہم مخالف مذہبی گروہوں پر مشتمل ایک ہجوم میں بدل گئے جن کی تخت کے لیے چھینا جھپٹی کی ایک طویل تاریخ سامنے آگئی تھی۔

کردار کو بناتے ہوئے اس کے کن امتیازی اوصاف کو سامنے رکھنا ہے اور اس کی شخصیت کن واقعات سے ابھرے گی، اس کا تعین فنکار کا شعور کرتا ہے۔ جب ہم مابعد نو آبادیات کی روشنی میں اُردو فکشن کا جائزہ لیں

گے تو اسی فنکارانہ شعور کے تجزیے سے آغاز کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر انگریز افسر کو ابن الوقت کے خلاف ایک ہندو سر شتہ دار بھڑکاتا ہے۔ یہاں نذیر احمد کا ذہن کرداروں کے درمیان مذہب کی بنا پر امتیاز قائم کر رہا ہے، اسی ناول میں نوبل مسلمانوں اور ہندوؤں میں عادات و خصائل کے لحاظ سے فرق کرتا ہے۔ اس کی رائے ہے کہ مسلمان کی فقیری میں بھی طنطنہ ہے اور ہندو ذلیل خوش آمد کرتے ہیں۔ کسی قوم کے بارے ایسے بیانات کی موجودگی جہاں واحد شناخت کے بے لچک روپ کو فکشن میں قبول کرتے چلے جانے کو ظاہر کر رہی ہے، وہیں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ ایسے عمومی بیان انسانی سماج میں پائی جانے والی روز مرہ کثرت کا انکار ہیں۔ امرتیہ سین نے Identity and Violence (تشخص اور تشدد) میں دکھایا ہے کہ ایک انسان بیک وقت کئی شناختوں کا حامل ہوتا ہے، وہ کرکٹ کا کھلاڑی، استاد، والد، فلم بین، فٹ بال پسند کرنے والا، عورتوں کے حقوق کا حامی اور سبزی خور ہو سکتا ہے۔[۲] تاہم جوہری (Essentialist) شناخت کے حامی اس کی کسی واحد شناخت پر اصرار کرتے ہیں۔ میرے مشاہدے کی حد تک ہمارے بڑے فکشن نگار ان جوہری شناختوں کو قبول نہیں کرتے اور شاید ہمارا اجتماعی لاشعور بھی اس قدغن کو ناپسند کرنے کی وجہ سے ایسے فکشن نگاروں سے محبت رکھتا ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی تک آتے آتے استعماری علمی وضعوں اور سماجی درجہ بندیوں کے زیرِ اثر بنائے جانے والے نصابات پر دو سے تین خواندہ نسلیں تیار ہو چکی تھیں۔ اردو فکشن نگار کے پاس اُس وقت اپنے کرداروں کو اس علمیات کی روشنی میں دیکھنے، اس سے جوجھنے یا اس کا انکار کرنے کا راستہ موجود تھا۔ ہمارے ہاں قومی شناخت کی کسی واحد بنیاد کو قبول کرنے والے فکشن نگار بظاہر ہمیں استعماریت کے خلاف مزاحمت کی آوازیں بتائے جاتے ہیں، تاہم میری رائے میں یہ مصنفین استعماری شعور کو مقبول بنانے کا کردار ادا کر رہے تھے۔ مثلاً انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں اردو ادیبوں پر اصلاح کا جنون طاری تھا۔ ان کی تحریروں میں ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافت کو ہندوستان کی مقامی ثقافتوں سے علیحدہ کرنے کا خروش ہے۔[۳] مقامی دیسی ثقافتوں اور ان کے مختلف مظاہر پر ہندووانہ ہونے کی پھبتیاں تو خیر آج تک کسی جا رہی ہیں۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ خود اردو زبان ہندوستان کی پیداوار ہونے کے باوصف مسلمانوں کی ہے تو بسنت سے نفور کیوں۔ اس دور کے فکشن کو بغور پڑھا جائے تو ایسی متعدد مثالیں مل جائیں گی جن میں مصنف دیسی رسم و رواج سے خدا واسطے کا بیر رکھتا ہے۔[۴] بظاہر وہ مسلم زندگی کو دیگر ثقافتی آلائشوں سے پاک کرنے کا مقصد پیشِ نظر رکھتا ہے تاہم وہ استعماری دائرے کو قبول کر رہا ہے جہاں ہر قوم کی شناخت ان کی امتیازی صفات سے قائم ہوتی ہے۔ ایک سادہ مثال عرض کرتا ہوں۔ ہمارا خطہ جاپان، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، ملائیشیا، انڈونیشیا وغیرہ کے مغرب میں واقع ہے لیکن ہم مشرقی ہیں، کیوں؟ کیوں کہ ہم یورپ کے مشرق میں پائے جاتے ہیں۔ اب زرا اپنے مشرقی

ہونے کی زڑ پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجیے۔ ہم جس قدر زیادہ مشرقی ہونے کا ڈھول پیٹتے ہیں، اسی قدر استعماری افتراقی کلامیے (Colonial Differential Discourse) کے اسیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔[۵]

استعماریت کے دو سو برسوں کے دوران میں ہندوستانی فرد کے بارے 'نئے' تصورات نے ابتدائی صورت اختیار کی۔ اس دوران خواندہ، اَن پڑھ، شہری، دیہاتی، قدیم، جدید اور ایسی ہی دیگر سماجی اقسام کے بارے صفات کا تعین ہوا۔ اس تعین نے وہ زاویہ فراہم کیا جس میں فن کار کرداروں کی تصویر ذہن میں اتارتا ہے۔ کسی فکشن پارے کی قرأت میں یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ فن کار کے تجربے پر یہ زاویہ کس حد تک اثرانداز ہوا ہے۔ مثال کے طور پر اردو تاریخی ناول کا صرف جنگجوؤں سے سروکار اوران کی پیش کش میں دین اور نازنین کی حدود میں رہنا کسی تہذیبی سمندر کو زرا سی آب جو بنانے کے مترادف ہے۔[۶] اور ایسی باتیں استعماری کلامیے کے عین مطابق ہیں جہاں فرد کی واحد شناخت اور معدودی چند صفات اسے دیگر انسانی گروہوں سے ممیز کرتی ہیں۔

استعماریت کا ایک غیر محسوس اثر مدام تقابل ہے۔ اوّل اوّل استعمار کار اپنی تحریر اور روزمرہ طرزِ عمل سے خود کو ہر معاملے میں مستعمریوں سے افضل دکھاتا ہے۔ نتیجتاً استعمار زدہ عموماً اپنا تصور نوآبادکار کے بغیر کرنا بھول جاتا ہے۔[۷] اس سے دو مختلف طرزِ عمل سامنے آتے ہیں: 'اُن' جیسا بننے کی خواہش اور اُن سے ہر بات میں مختلف ہونے کی تمنا۔ بظاہر دونوں رویوں میں بعد المشرقین ہے، تاہم غائر نظر سے دیکھیے اصل میں دونوں ایک ہیں۔ کسی مرکز سے بھاگنے کی کوشش، اسی مرکز سے باندھ دیتی ہے۔ ردِ عمل کی نفسیات میں جینے والا اپنے عمل میں آزاد نہیں، عامل کا محتاج ہوتا ہے۔ اگر عامل درست بات کہہ دے تو ردِ عمل میں غلط کا دامن تھامنا پڑتا ہے۔ وہ دن کا اعلان کرتا ہے تو دوسرے کو رات میں چھپنا پڑتا ہے۔ یہ نفسیات آج کئی سیاسی جماعتوں کے ہاں دیکھی جا سکتی ہے جو آسمان پر خدا کو براجمان دیکھتے ہیں اور زمین پر امریکہ کی مالا جپتے ہیں۔ جب ہر برائی کی جڑ امریکہ کو تصور کر لیا جائے تو اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہم ان جانے میں اُسی کی قدرت کا اقرار کر رہے ہیں۔ اس ردِ عملی نفسیات سے استعمار زدہ ہر شے یا مظہر کی تفہیم میں ٹھوکر کھاتا ہے، جس سے تصورات کی ایک متبادل دنیا وجود میں آتی ہے جسے استعمار زدہ اپنی روایت یا رواج کہتا ہے۔ میر کے لیے دَیر میں بیٹھنا اور غالب کے لیے برہمن کو کعبے میں گاڑنا کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا تاہم ردِ عمل کا جوش ہمارے لیے فیض کی شاعری کو بھی کفر بنادیتا ہے۔ اردو فکشن کی پڑھت میں مدام تقابل کی وجہ بننے والی ردِ عمل کی نفسیات کا جائزہ ضروری ہے۔[۸]

تقابلی مزاج جارحانہ حد تک ثنویت پسند ہوتا ہے۔ اس ثنویت کے ڈانڈے بھی نوآبادکار اور دیسیوں کے تقابل سے جا ملتے ہیں جو استعماری کلامیے کا جوہر ہے۔ جہاں استعمار کار کی ہر خوبی کو مستعمری کردار کی خامی سے جواز ملتا ہے۔ اردو فکشن کے ابتدائی نمونوں میں کرداروں کو سیاہ و سفید یا خیر و شر کی واضح تقسیم میں پیش کرنا

اسی ثنویت پسند ذہن کا شاخسانہ ہے۔ کبھی انیسویں صدی کے اردو ناول اور بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کے افسانے میں کردار اور اقدار کی سطح پر پائی جانے والی اس اضدادی ثنویت پر غور کیا جائے تو موجودہ شدت پسندی کا نسب نامہ مرتب کرنے میں آسانی رہے گی۔ یہ بھی دیکھتے چلیے کہ اردو کے بہترین فکشن نگاروں پر تبرے اسی لیے بھیجے گئے کہ وہ اس متشدد ثنویت کے انکاری تھے اور یہ بات نظر انداز کرنے کی نہیں کہ تبروں کے لیے استعمار کی سرکاری انتظامیہ نے ادارہ جاتی ماحول فراہم کیا جس کی بنیادیں سنسر شپ ایکٹ جیسے قوانین میں رکھ دی گئی تھیں۔

جاننا چاہیے اردو فکشن کی معراج ڈکنس بننا نہیں ہے۔ ڈکنس سے کہانی کہنے کا فن سیکھنے میں کوئی قباحت نہیں صرف اس ذہنی تشکیل سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے جو موجود ادبی روایت کو بے دست وپا، منجمد اور ازکارِ رفتہ تسلیم کر لیتا ہے۔

ہمارے ساتھ خرابی یہ ہوئی کہ ہم نے جدید کی قرات استعماریت کے اوراق سے کی۔ نتیجہ ہم جدت کی طرف لپکتے ہیں تو نقل کی وادی میں ٹھوکریں کھاتے ہیں اور اس سے دامن بچاتے ہیں تو ساختہ روایت(Invented Tradition)کے صحرا میں گم ہو جاتے ہیں۔[۹] دوسرا مسئلہ جدید کو استعماریت سے الگ کرنے کا ہے۔ ایسا اسی وقت ممکن ہے جب ہم انسان، سماج، فرد، کائنات اور مختلف مظاہر کے حوالے سے بنے بنائے تصورات پر سوال اٹھائیں، ان کے توارث کا جائزہ لیں اور خود سوالات کے طریقہ کار اور علمی بنیاد کو بھی مسلسل چنوتی دیں۔ اس کے لیے ہمیں کثیر ثقافتی تناظر درکار ہے۔ کسی واحد قومی، لسانی یا مذہبی پہچان پر توجہ کا ارتکاز بنے بنائے استعماری سانچوں میں سوچنے کی عادت ہے، جس نے مسلسل ہمیں مغالطوں کا قیدی بنا رکھا ہے۔

حوالہ جات

1. تفصیل کے لیے دیکھیے:

John Borthwick Gilchrist, *A Grammar of the Hindustanee Language* (Calcutta: Chronicle Press, 1796)

2. امر تیا سین، تشخص اور تشدد، مترجمہ پروفیسر مقبول الٰہی (لاہور: مشعل بکس، ۲۰۰۶ء)

3. ۱۸۷۰ء کے بعد اردو میں اصلاحی فکشن لکھنے کا رجحان حاوی نظر آتا ہے جس میں دیسی رسم و رواج اور ثقافت سے ناتا توڑنے اور خود کو مقامی آبادی سے ممیز کرنے کی روش ملتی ہے۔ اس حوالے سے نذیر احمد، رشیدۃ النسا اور شاد عظیم آبادی کا فکشن دیکھا جا سکتا ہے۔

4. حالی نے لکھا: "رسمیں تو سب ہی بری ہوتی ہیں پر بعض حد سے زیادہ بری ہوتی ہیں۔" حالی، مولانا الطاف حسین، مجالس النسا، حصہ اول (لاہور: مکتبہ سرکاری، ۱۸۸۳ء)، ص ۴۶

5. استعماریت کے افتراقی بیانیے کی وضاحت اور تفصیل کے لیے دیکھیں:

- Edward W. Said, *Culture and Imperialism* (London: Vintage, 1993)
- Edward W. Said, *Orientalism* (London: Vintage, 1978)
- Homi Bhabha, *The Location of Culture* (London: Routledge, 1994)
- Robert J. C. Young, *White Mythologies* (London: Routledge, 1990)

6. تاریخی اردو ناول کا بیشتر سرمایہ محض جنگ و جدل سے اٹا پڑا ہے جس میں عام طور پر توحید کے لیے لڑی جانے والی جنگ غیر مسلم حسیناؤں کے حصول میں بدل جاتی ہے۔ اس پہلو پر مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد نعیم ورک، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ (لاہور: کتاب محل، ۲۰۱۹ء)

7. Frantz Fanon, *Black Skin White Masks*, Trans. by Charles Lam Markmann (London: Pluto Press, 1986)

8. استعمارزدہ ذہن کی رد عملی نفسیات پر اختر علی سید نے مضامین لکھے ہیں جو 'ہم سب' کی ویب سائٹ پر سلسلہ وار شائع ہوئے۔ ملاحظہ ہو:

http://www.humsub.com.pk/8080/akhtar-ali-syed-6/

9. Eric Habsbaum and Terence Ranger, eds., *The Invention of Tradition.* (Cambridge: Cambridge University Press, 1983)